رسائل و مسائل

میثاق النبیین

سوال: تفہیم القرآن سورۂ آل عمران صفحہ ۲۶۸ رکوع ۹، آیت " وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ ... الخ" کی تشریح کرتے ہوئے آپ نے حاشیہ نمبر ۶۹ یوں درج کیا ہے کہ " یہاں اتنی بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہر نبی سے یہی عہد لیا جاتا رہا ہے اور اسی بنا پر ہر نبی نے اپنی امت کو بعد کے آنے والے نبی کی خبر دی ہے اور اس کا ساتھ دینے کی ہدایت کی ہے۔ لیکن نہ قرآن میں، نہ حدیث میں، کہیں بھی اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا عہد لیا گیا ہو، یا آپؐ نے اپنی امت کو کسی بعد کے آنے والے نبی کی خبر دے کر اس پر ایمان لانے کی ہدایت فرمائی ہو۔"

اس عبارت کا مطالعہ کرنے کے بعد دل میں یہ بات آئی کہ بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تو نہیں فرمایا، لیکن خود قرآن مجید میں سورۂ احزاب میں ایک میثاق کا ذکر یوں آتا ہے: وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَھُمْ وَمِنْکَ وَمِنْ نُّوْحٍ .... الخ۔ یہاں لفظ "مِنْکَ" کے ذریعے نبی صلعم سے خطاب ہے۔ میثاق وہی ہے کہ جس کا ذکر سورۂ آل عمران میں ہو چکا ہے۔ ہر دو سورتوں، یعنی آل عمران اور الاحزاب کی مذکورۂ بالا آیات میں میثاق کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہی میثاق جو دوسرے انبیاء سے لیا گیا تھا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی لیا گیا ہے۔

دراصل یہ سوال احمدیوں کی ایک کتاب پڑھنے سے پیدا ہوا ہے جس میں ان دونوں سورتوں کی محولہ بالا آیات کی تفسیر ایک دوسرے کی مدد سے کی گئی ہے اور لفظ " منک " پر بڑی

بحث درج ہے۔

جواب:- آیت وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُوحٍ . . " (الاحزاب)

سے قادیانی حضرات جو استدلال کرتے ہیں وہ اگر مبنی بر اخلاص ہے تو ان کی جہالت پر دلالت کرتا ہے اور اگر قصداً دھوکا دینے کی نیت سے ہے تو یہ ان کی ضلالت پر دال ہے۔ وہ ایک مضمون تو سورۂ آل عمران کی آیت وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ . . . . . رکوع ۵) سے لیتے ہیں جس میں انبیاء اور ان کی امتوں سے کسی آنے والے نبی کی پیروی کا عہد لیا گیا ہے، اور دوسرا مضمون سورۂ احزاب کی مذکورۂ بالا آیت سے لیتے ہیں جس میں دوسرے انبیاء کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ایک عہد لیے جانے کا ذکر ہے، پھر دونوں کو جوڑ کر اس سے یہ تیسرا مضمون خود بنا ڈالتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کسی آنے والے نبی پر ایمان لانے اور اس کی تائید و نصرت کرنے کا عہد لیا گیا تھا۔ حالانکہ جس آیت میں آنے والے نبی پر ایمان لانے کے میثاق کا ذکر ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ عہد ہم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی لیا ہے، اور جس آیت میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک عہد لیے جانے کا ذکر ہے اس میں کوئی تصریح اس امر کی نہیں ہے کہ یہ عہد کسی آنے والے نبی کی پیروی کا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ آخر ان دو مختلف مضمونوں کو جوڑ کر ایک تیسرا مضمون جو قرآن میں کہیں نہ تھا، کس دلیل سے پیدا کر لیا گیا؟

اس کے لیے اگر ہو سکتی تھیں تو تین ہی دلیلیں ہو سکتی تھیں:

یا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے نزول کے بعد صحابہ کو جمع کر کے اعلان فرمایا ہوتا کہ "لوگو! اللہ نے مجھ سے یہ عہد لیا ہے کہ میرے بعد جو نبی آئے اس پر میں ایمان لاؤں اور اس کی تائید و نصرت کروں، لہٰذا میرے متبع ہونے کی حیثیت سے تم بھی اس کا عہد کرو" ۔۔۔۔۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ حدیث کے پورے ذخیرے میں اس مضمون کا کہیں نام و نشان تک نہیں، بلکہ الٹی بکثرت روایات ایسی موجود ہیں جن سے یہ مضمون نکلتا ہے کہ حضورؐ پر سلسلۂ نبوت ختم ہو گیا اور آپ کے بعد اب کوئی نبی پیدا ہونے والا نہیں ہے۔ کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ایسا اہم میثاق لیا گیا ہوتا

اور آپ نے اسے یوں نظر انداز کر دیا ہوتا، اور الٹی ایسی باتیں فرمائی ہوتیں جن سے حجت پکڑ کر آپ کی امت کا سوادِ اعظم خدا کے فرستادہ نبی پر ایمان لانے سے محروم رہ جاتا؟

دوسری دلیل یہ مضمون پیدا کرنے کے لیے یہ ہو سکتی تھی کہ قرآن میں انبیاء اور ان کی امتوں سے بس ایک ہی میثاق لیے جانے کا ذکر ہوتا، یعنی یہ کہ بعد کے آنے والے نبی پر ایمان لانا۔ اس کے سوا کسی اور میثاق کا پورے قرآن میں کہیں ذکر ہی نہ ہوتا۔ اس صورت میں یہ استدلال کیا جا سکتا تھا کہ سورۂ احزاب والی آیتِ میثاق میں بھی لا محالہ یہی میثاق مراد ہوگا۔ لیکن اس دلیل کے لیے بھی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے، کیونکہ قرآن میں متعدد میثاقوں کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ رکوع ۱۰ میں بنی اسرائیل سے اللہ کی بندگی اور والدین سے حسن سلوک اور آپس کی خوں ریزی سے پرہیز وغیرہ کا میثاق لیا جانا ہے۔ سورۂ آل عمران رکوع ۱۹ میں تمام اہلِ کتاب سے اس بات کا میثاق لیا جاتا ہے کہ خدا کی جو کتاب تمہارے حوالے کی گئی ہے اس کی تعلیمات کو چھپاؤ گے نہیں بلکہ اس کی عام اشاعت کرو گے۔ سورۂ اعراف رکوع ۲۱ میں بنی اسرائیل سے عہد لیا جاتا ہے کہ وہ اللہ کے نام پر حق کے سوا کوئی بات نہ کہیں گے، اور اللہ کی دی ہوئی کتاب کو مضبوط ہاتھوں سے تھامیں گے، اور اس کی تعلیمات کو یاد رکھیں گے۔ سورۂ مائدہ رکوع ۱۰ میں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کو ایک میثاق یاد دلایا جاتا ہے جو انہوں نے اللہ سے کیا تھا اور وہ یہ ہے کہ "تم اللہ سے سمع و طاعت کا عہد کر چکے ہو"۔ سوال یہ ہے کہ اگر سورۂ احزاب والی آیت میں میثاق کے مضمون کی تصریح کے بغیر مجرّد میثاق کا ذکر آیا تھا، تو اس خلاء کو ان بہت سے میثاقوں میں سے کسی ایک سے بھرنے کے بجائے بالخصوص سورۂ آل عمران رکوع ۹ والے میثاق ہی سے کیوں بھرا جائے؟ اس ترجیح کے لیے خود ایک دلیل درکار ہے جو کہیں موجود نہیں۔ اس کے جواب میں اگر کوئی یہ کہے کہ دونوں جگہ چونکہ نبیوں سے میثاق لینے کا ذکر ہے، اس لیے ایک آیت کی تشریح دوسری آیت سے کر لی گئی، تو میں عرض کروں گا کہ دوسرے جتنے میثاق بھی انبیاء کی امتوں سے لیے گئے ہیں وہ براہ راست کسی امت سے نہیں لیے گئے بلکہ انبیاء کے واسطے ہی سے لیے گئے ہیں۔ اور آخر قرآن میں بصیرت رکھنے والا کون شخص اس بات سے ناواقف ہے کہ ہر نبی سے کتاب اللہ کو مضبوط تھامنے اور اس کے احکام کی پیروی کرنے کا عہد لیا گیا ہے؟

تیسری دلیل یہ ہو سکتی تھی کہ سورۂ احزاب کا سیاق و سباق یہ بتا رہا ہوتا کہ یہاں میثاق سے مراد کسے

والے نبی پر ایمان لانے کا میثاق ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن یہاں معاملہ بالکل ہی برعکس ہے۔ سیاق و سباق تو الٹا اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ یہاں یہ معنی ہو ہی نہیں سکتے۔ سورۂ احزاب شروع ہی اس فقرے سے ہوتی ہے کہ "اے نبی اللہ سے ڈرو اور کافروں اور منافقوں سے نہ دبو اور جو وحی تمہارا رب بھیجتا ہے اسی کے مطابق عمل کرو اور اللہ پر بھروسا رکھو۔" اس کے بعد یہ حکم سنایا جاتا ہے کہ جاہلیت کے زمانے سے متبنّٰی بنانے کا جو طریقہ چلا آ رہا ہے اس کو اور اس سے تعلق رکھنے والے تمام اوہام اور رسموں کو توڑ ڈالو۔ اس کے بعد فرمایا جاتا ہے کہ غیر خونی رشتوں میں صرف ایک ہی رشتہ ایسا ہے جو خونی رشتوں سے بھی بڑھ کر حرمت والا ہے، اور وہ ہے نبی اور مومنین کا رشتہ، جس کی بنا پر نبی کی بیویاں ان کی ماؤں کی طرح ان پر حرام ہیں، ورنہ باقی تمام معاملات میں رحمی اور خونی رشتے ہی اللہ کی کتاب کی رو سے حرمت اور استحقاق وراثت کے لیے اولیٰ و انسب ہیں۔ یہ احکام بیان فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ میثاق یاد دلاتا ہے جو اس نے تمام انبیاءؑ سے ہمیشہ لیا ہے اور ان کی طرح آپ سے بھی لیا ہے۔ اب ہر معقول آدمی خود ہی دیکھ سکتا ہے کہ اس سلسلۂ کلام میں آخر کس مناسبت سے ایک آنے والے نبی پر ایمان لانے کا میثاق یاد دلایا جا سکتا تھا؟ یہاں تو اگر یاد دلایا جا سکتا تھا تو وہی میثاق یاد دلایا جا سکتا تھا جو خدا کی کتاب کو مضبوط تھامنے اور اس کے احکام کو یاد رکھنے اور ان پر عمل کرنے اور دنیا پر ان کا اظہار کرنے کے لیے تمام انبیاء سے لیا گیا ہے۔ پھر آگے چل کر ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صاف صاف حکم دیتا ہے کہ آپ خود اپنے متبنّٰی زیدؓ بن حارثہؓ کی مطلقہ بیوی سے نکاح کر کے جاہلیت کے اس وہم کو توڑ دیں جس کی بنا پر لوگ منہ بولے بیٹے کو بالکل صُلبی بیٹے کی طرح سمجھتے تھے۔ اور جب کفار و منافقین اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو علی الترتیب تین جواب دیتا ہے:

اوّل تو محمدؐ تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں کہ اس کی مطلقہ بیوی ان پر حرام ہوتی،

اور اگر تم یہ کہتے ہو کہ وہ اُن کے لیے حلال تھی بھی تو اُس سے نکاح کرنا کیا ضرور تھا، تو یہ اس لیے ضروری تھا کہ وہ اللہ کے رسول ہیں جن کا کام ہی یہ ہے کہ جس چیز کو اللہ مٹانا چاہتا ہے، اُسے خود آگے بڑھ کر مٹائے،

اور مزید برآں ان کو ایسا کرنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ وہ محض رسول ہی نہیں ہیں بلکہ خاتم النبیین ہیں، اگر وہ جاہلیت کی ان رسموں کو مٹا کر نہ جائیں گے تو پھر کوئی ایسا نبی آنے والا بھی نہیں ہے جو انہیں مٹائے۔

اس مضمون لاحق کو اگر کوئی شخص مضمون سابق کے ساتھ ملا کر پڑھے تو وہ یقین کے ساتھ یہ کہہ دیگا کہ اس سیاق و سباق میں جو

میثاق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد دلایا گیا ہے اُس سے مراد اور جو میثاق بھی ہو، بہرحال کسی آنے والے نبی پر ایمان لانے کا میثاق تو ہرگز نہیں ہو سکتا

دیکھ لیجیے، آیت زیر بحث سے قادیانیوں کے بیان کردہ معنی لینے کے لیے یہی تین دلیلیں ہو سکتی تھیں، اور یہاں ان میں سے ہر دلیل ان کے مدعا کے لیے غیر مفید، بلکہ الٹی ان کے مدعا کے خلاف ہے۔ اب اگر ان کے پاس کوئی چوتھی دلیل ہو تو وہ ان سے دریافت کیجیے، اور ان تینوں دلیلوں کا جواب بھی ان سے لیجیے۔ ورنہ یہ ماننے کے سوا چارہ نہیں کہ اس آیت سے جو معنی انہوں نے نکالے ہیں وہ یا تو جہالت کی بنا پر نکالے ہیں، یا پھر خدا سے بخوف ہو کر خلق خدا کو گمراہ کرنے کے لیے نکالے ہیں۔ بہرحال ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اگر مرزا صاحب نبی تھے تو آخر کیا معاملہ ہے کہ ابھی ان کے صحابہ کا دور بھی ختم نہیں ہوا ہے اور ان کی ساری امت اس وقت تابعین اور تبع تابعین پر مشتمل ہے، وہ پھر حال یہ ہے کہ کتاب اللہ سے ان کی امت میں علی الاعلان ایسے غلط استدلال کیے جاتے ہیں اور پوری امت میں سے ایک آواز بھی اس جہالت یا ناخدا ترسی کے خلاف بلند نہیں ہوتی۔

گناہ و توبہ ——— زنانہ درسگاہوں میں جنسی باتیں

سوال:۔ تحریک اسلامی کا لٹریچر زیر مطالعہ ہے۔ آپ نے جس واضح طریق سے احکام الٰہی و دیگر حقائق فرقانی سے عوام کو روشناس کرانے کی کوشش کی ہے، اس سے میں بہت متاثر ہو چکا ہوں۔ اب مجھے اپنی زندگی کے بارے میں چند مسائل میں آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔

میں نے ایسے ماحول میں پرورش پائی ہے جہاں اٹھنے بیٹھنے کے آداب سے لے کر زندگی کے عظیم ترین مسائل تک شریعت کی پابندی ہوتی رہی ہے اور اب میں ایک کالج میں تعلیم پا رہا ہوں۔ ماحول کی اچانک تبدیلی اور اس کے فوری اثر نے مجھے عجیب کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے۔ بعض غیر اسلامی حرکات مجھ سے سرزد ہو گئی ہیں، لیکن ان کے سرزد ہونے پر ضمیر نے ——— جو اب تک زندہ ہے ——— ملامت کی بوچھاڑ کر دی۔ پورے اہتمام سے توبہ کی اور غفور الرحیم سے عفو کا طالب ہوا، مگر بے اطمینانی بدستور رہی۔ ستم یہ کہ کچھ اثر ڈالنے والوں کے اصرار اور شیطانی غلبے کے تحت پھر ویسی ہی حرکت سرزد ہو گئی۔ توبہ توڑنے پر پھر پشیمانی ہوئی اور خدا کے حضور حاضر ہو کر پھر عفو کا طلبگار ہوا۔ دل بدستور غیر مطمئن ہے۔ بار بار

یہی خیال آتا ہے کہ میرا گناہ نہ جانے معاف ہوگا یا نہیں۔ یوں اپنی حد تک عملی اصلاح بھی کر لی ہے اور بظاہر اُس غلطی کے دوہرانے کی اب کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ خدا سے بار بار دعا کرنے کے باوجود دل میں یہ چیز بیٹھ سی گئی ہے کہ میں نے چونکہ توبہ کر کے پھر جرم کیا ہے اس لیے خدا مجھے اس کا عذاب دے گا۔

آپ اس بارے میں اپنی ہدایت سے سرفراز فرمائیں کہ میں اپنے گناہ اور توبہ توڑنے کا کفارہ کس صورت میں ادا کر دوں کہ اللہ تعالیٰ کے حضور سے میری معافی ہو جائے اور ضمیر کی ملامت سے مجھے نجات مل جائے۔

دوسرا اصل طلب مسئلہ یہ ہے کہ ان دنوں زنانہ کالجوں کی مسموم فضا نے لڑکیوں میں عجیب بائیں پھیلا رکھی ہیں۔ بالعموم دو لڑکیوں کی دوستی خلوص اور محبت کی حدود پار کر کے "جنسی ربط" کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ اس طرح کے تعلق کا آغاز تو معصوم سا ہوتا ہے لیکن آگے چل کر یہ انتہائی گندی حالت کو جا پہنچتا ہے۔ شرعاً یہ چیز کس درجے کا گناہ ہے۔ کبیرہ یا صغیرہ!

جواب: گناہ کا علاج توبہ و اصلاح ہے۔ توبہ کر کے آدمی خواہ کتنی ہی بار توڑ دے، پھر توبہ کرنی چاہیے اور پھر اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک آدمی کسی بلند پہاڑی راستے پر چلتے ہوئے خواہ کتنی ہی بار پھسل پھسل کر گرتا ہے، اسے ہر بار گرنے کے بعد اُٹھنے اور اوپر چڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس امر کا اہتمام کرنا چاہیے کہ پھر کبھی نہ پھسلے۔ جو شخص پھسل کر پھر نہ اُٹھے اور پستی ہی میں پڑا رہے وہ تو ضرور بُرا انجام دیکھے گا۔ مگر جو گر کر اٹھ جائے اور لغزشوں کے باوجود آخر کار سیدھی راہ پر ثابت قدم ہو جائے اسے اللہ تعالیٰ فائز المرام ہونے سے محروم نہ رکھے گا اور اس کی لغزشوں پر گرفت نہ فرمائے گا۔ آپ کے قلب میں اپنی لغزشوں پر ندامت و شرمساری کا احساس تو ضرور رہنا چاہیے، اور عمر بھر اپنے رب سے معافی ضرور مانگتے رہنا چاہیے، لیکن یہ شرمساری کبھی یہ شکل اختیار نہ کرنے پائے کہ آپ اپنے رب کی رحمت سے مایوس ہونے لگیں اور یہ خیال کرنے لگیں کہ توبہ و اصلاح کے باوجود وہ آپ کو معاف نہ کریگا۔ کیونکہ اس طرح کی مایوسی اللہ تعالیٰ سے بدگمانی ہے اور اس میں یہ خطرہ بھی ہے کہ جب آدمی کو مغفرت سے بچنے کی امید نہ رہے گی تو شیطان اسے دھوکا دے کر گناہ کے چکر میں بآسانی پھانس لے گا۔

آپ کے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ مرد اور مرد کی جنسی محبت جتنا بڑا گناہ ہے، عورت اور عورت کی جنسی محبت بھی اتنا ہی بڑا گناہ ہے۔ اخلاقی حیثیت سے ان دونوں برائیوں میں نوعیت کا فرق ہے اور نسبت

افسوس ہے کہ یہ نام نہاد "ادب لطیف" جو رسالوں اور افسانوں اور ناولوں کی شکل میں گھر گھر پہنچ رہا ہے، اور یہ فحش تصویریں اور فلم جنہیں آزادی کے ساتھ مردوں کی طرح عورتیں بھی دیکھ رہی ہیں، اور یہ عشق آموز گانے جو ریڈیو کی برکت سے بچے بچے کی زبان پہ چڑھ رہے ہیں، اور یہ اختلاطِ مرد و زن جس کو روز بروز ہماری سوسائٹی میں فروغ نصیب ہو رہا ہے، ان ساری چیزوں نے مل جل کر نوجوان مردوں کی طرح نوجوان لڑکیوں کو بھی غیر معمولی جذباتی ہیجان میں مبتلا کر دیا ہے۔ شہوانی جذبات کی ایک بھٹی ہے جو سینوں میں بھڑکا دی گئی ہے اور بہت سی دھونکنیاں ہر آن اسے زیادہ اور زیادہ بھڑکانے میں لگی ہوئی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو بگاڑ اب تک زیادہ تر مردوں میں پایا جاتا تھا، وہ ایک وبا کی طرح شریف گھروں کی لڑکیوں اور درس گاہوں کی طالبات اور استانیوں میں بھی پھیلنا شروع ہو گیا ہے۔ جن خواتین کو زنانہ درس گاہوں کے حالات قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے ان کی اطلاع یہ ہے کہ آج لڑکیوں میں جو بے حیائی، بے باکی، جنسی مسائل پہ کھلی کھلی گفتگو کرنے کی جرأت اور جنسی رجحانات — فطری اور غیر فطری، ہر دو طرح کے رجحانات — کے اظہار و اعلان کی عام جسارت پائی جاتی ہے، چند سال پہلے تک اس کا تصور کرنا مشکل تھا۔ اب لڑکیوں میں یہ چرچے عام ہو رہے ہیں کہ کونسی صاحبزادی کس استانی کی منظورِ نظر ہیں، اور کونسی صاحبزادی کس دوسری صاحبزادی کے عشق میں مبتلا ہیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون!

لطف یہ ہے کہ اس جہنم کی طرف جو لوگ اپنی قوم کو دھکیل رہے ہیں وہ اپنی اب تک کی کوششوں کے نتائج سے بھی مطمئن نہیں ہیں۔ انہیں حسرت یہ ہے کہ کاش مُلّا کی مخالفت و مزاحمت راہ میں حائل نہ ہوتی تو وہ ترقی کے مزید قدم ذرا جلدی جلدی اٹھا سکتے!

توبہ، گناہ، کفّارہ

سوال:- یہ دور ہیجانی دَور ہے، ہر طرف فسق و فجور کا زور ہے، ایسے تاریک ماحول

میں اگر ایک نوجوان جو طبعاً پرہیزگار اور دیانت کیش ہو گناہ کا مرتکب ہو جائے اور پھر تائب ہو کر خدا کے حضور گناہ سے اجتناب کرنے کی قسم کھالے، لیکن کچھ مدت بعد اگر شیطان کے غلبے کے تحت وہ پھر گناہ کر بیٹھے تو اس کے لیے راہِ نجات کیا ہے؟ کوئی سزا یا کوئی کفارہ جو اس پر لازم آتا ہو، تحریر فرمادیں۔

جواب:۔ (۱) جو شخص گناہ سے توبہ کرنے کے بعد پھر گناہ کا مرتکب ہو جائے، اسے چاہیے کہ پھر توبہ کرے اور سچے دل سے بچنے کی کوشش کرے۔ توبہ کے بھروسے پر جان بوجھ کر گناہ کرنا مومن کا کام نہیں ہے۔ لیکن اگر نفس کی کمزوری کی وجہ سے کوشش کے باوجود گناہ میں مبتلا ہو جائے تو بار بار توجہ کرنی چاہیے اور ہر بار پہلے سے زیادہ اجتناب کی کوشش جاری رکھنی چاہیے۔ توبہ کو مضبوط بنانے اور گناہ کے اثرات کو دور کرنے میں نفل نماز، نفل روزے اور صدقات بہت کارگر ثابت ہوتے ہیں۔ اس سے اللہ کی رحمت بھی بندے کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور بندے کو بھی اپنے نفس کی اصلاح میں مدد ملتی ہے[1]۔

(۲) اگر توبہ کے علاوہ آدمی نے قسم بھی کھائی ہو اور پھر اسے توڑ دیا ہو تو قسم کا کفارہ واجب ہے، یعنی دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا تین دن کے روزے رکھنا۔

رشوت اور اضطرار

سوال:۔ دو سوال پوچھ رہا ہوں جن کے بارے میں عوام الناس کے ذہن صاف نہیں ہیں اور یہ سوال بہت عام ہیں:۔

[1] حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کے مقابلے میں نفس کو مضبوط بنانے اور گناہ کی تحریکات کی مدافعت کرنے کے لیے توبہ کے ساتھ نفل نماز، نفل روزے اور نفل صدقے کا اہتمام کرنا بہت اثر رکھتا ہے، اور ایک گناہ کی تکرار اور توبہ شکنی کے بعد اس تدبیرِ اصلاح میں مزید اضافہ کر دینا اُس کمزوری کو دور کرنے کا وسیلہ ہوگا جو تکرارِ معصیت سے پیدا ہو جاتی ہے۔

(۱) حالتِ اضطرار کیا ہے؟ کیا اضطرار کے بھی حالات اور ماحول کے لحاظ سے مختلف درجات ہیں؟

(۲) موجودہ حالات اور موجودہ ماحول میں کیا مسلمانوں کے لیے کسی صورت میں بھی رشوت جائز ہو سکتی ہے؟

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے رشوت کی ایک جامع تعریف بھی بیان کر دیجیے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کس کس قسم کے معاملات رشوت کی تعریف میں آتے ہیں۔

جواب: اضطرار یہ ہے کہ آدمی کو شریعت کی مقرر کی ہوئی حدود سے کسی حد پر قائم رہنے میں ناقابلِ برداشت نقصان یا تکلیف لاحق ہو۔ اس معاملہ میں آدمی اور آدمی کی قوتِ برداشت کے درمیان بھی فرق ہے اور حالات اور ماحول کے لحاظ سے بھی بہت کچھ فرق ہو سکتا ہے۔ اسی لیے اس امر کا فیصلہ کرنا کہ کون شخص کس وقت کن حالات میں مضطر ہے، خود اس شخص کا کام ہے جو اس حالت میں مبتلا ہو۔ اسے خود ہی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے اور آخرت کی جواب دہی کا احساس کرتے ہوئے یہ رائے قائم کرنی چاہیے کہ آیا وہ واقعی اس درجہ مجبور ہو گیا ہے کہ خدا کی کوئی حد توڑ دے؟

موجودہ حالات ہوں یا کسی اور قسم کے حالات، رشوت لینا تو بہرحال حرام ہے۔ البتہ رشوت دینا صرف اس صورت میں بربنائے اضطرار جائز ہو سکتا ہے جبکہ کسی شخص کو کسی ظالم سے اپنا جائز حق حاصل نہ ہو رہا ہو اور اس حق کو چھوڑ دینا اس کو ناقابلِ برداشت نقصان پہنچاتا ہو اور اوپر کوئی بااختیار حاکم بھی ایسا نہ ہو جس سے شکایت کر کے اپنا حق وصول کرنا ممکن ہو۔

رشوت کی تعریف یہ ہے کہ "جو شخص کسی خدمت کا معاوضہ پاتا ہو وہ اسی خدمت کے سلسلے میں اُن لوگوں سے کسی نوعیت کا فائدہ حاصل کرے جن کیلیے یا جن کے ساتھ اس خدمت سے تعلق رکھنے والے معاملات انجام دینے کے لیے وہ مامور ہو، قطع نظر اس سے کہ وہ لوگ برضا و رغبت اسے وہ فائدہ پہنچائیں یا مجبوراً۔ جو عہدہ دار یا سرکاری ملازمین تحفے تحائف کو اس تعریف سے خارج ٹھہرانے کی کوشش کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ ہر وہ تحفہ ناجائز ہے جو کسی شخص کو ہرگز نہ ملتا اگر وہ اس منصب پر نہ ہوتا۔ البتہ جو تحفے آدمی کو خالص شخصی روابط کی بنا پر ملیں، خواہ وہ اس منصب پر ہو یا نہ ہو۔ وہ بلاشبہ جائز ہیں۔

دارالکفر میں مقیم مسلمانوں کی مشکلات

سوال: برطانیہ کے قیام کے دوران میں احکام شریعت کی پابندی میں مجھے مندرجہ ذیل دشواریاں آرہی ہیں۔ براہ کرم صحیح رہنمائی فرما کر ممنون فرمائیں

(۱) پہلی دقت طہارت اور نماز کے بارے میں ہے۔ مجھے سویرے نو بجے اپنے ہوٹل سے نکلنا پڑتا ہے۔ اب اگر شہر میں گھومتے ہوئے رفع حاجت کی ضرورت پڑے تو ہر جگہ انگریزی طرز کے بیت الخلاء بنے ہوتے ہیں، جہاں کھڑے ہو کر پیشاب کرنا پڑتا ہے۔ اس سے کپڑوں پر چھینٹیں پڑنا لازمی ہے۔ استنجا کے لیے صرف کاغذ میسر ہوتے ہیں۔ ایک بجے ظہر کا وقت ہو جاتا ہے۔ اس وقت پانی کسی عام جگہ دستیاب نہیں ہو سکتا اور قیام گاہ تک آنے جانے کے لیے زحمت کے علاوہ کم از کم ایک شلنگ خرچ ہو جاتا ہے۔ نماز کے لیے کوئی پاک جگہ بھی نہیں مل سکتی۔ ہوٹل میں گو پانی اور لوٹا میسر ہیں مگر پتلون کی وجہ سے استنجا نہیں ہو سکتا، البتہ وضو کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس میں بھی یہ دقت ہے کہ پانی زمین پر نہ گرے۔ ہاتھ دھونے سے لے کر سر کے مسح تک تو خیر باسن (انگریزی بیسن) میں کام ہو جاتا ہے لیکن پاؤں دھونے کے لیے باسن میں رکھنے پڑتے ہیں جو یہاں کی معاشرت کے لحاظ سے انتہائی معیوب ہے

(۲) دوسری دشواری یہ ہے کہ یہاں لوگ عام طور پر کتے پالتے ہیں۔ ملاقات کے وقت پہلے کتے ہی استقبال کرتے ہیں اور کپڑوں کو منہ لگاتے ہیں۔ انتہائی کوشش کے باوجود اس مصیبت سے بچنا محال ہے۔ کیا ایسی صورت میں جرابوں اور کپڑوں کو بار بار دھلوایا جائے۔

(۳) تیسری دقت یہ ہے کہ دفاتر میں عموماً عورتیں ملازم ہیں۔ تعارف کے وقت و مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتی ہیں۔ اگر ہم ہاتھ نہ ملائیں تو اسے وہ اپنی انتہائی توہین سمجھتی ہیں۔ اسی طرح راستوں میں بھی اتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ اگر پیدل چلتے ہوئے ہم نگاہ نیچی رکھیں تو دھکا لگ جانے کا ہر وقت خطرہ رہتا ہے۔

(۴) چوتھی بات سینما سے متعلق دریافت طلب ہے۔ یہاں بعض سینما ایسے ہیں جن میں صرف دنیا کی خبریں دکھائی جاتی ہیں یا دنیا کے بعض اہم واقعات پردۂ فلم پر دکھاتے ہیں۔ مثلاً حال ہی میں کے ایل ایم کا جو جہاز گرا تھا اس کے گرنے کی فلم دکھائی گئی تھی۔ اسی طرح بعض اوقات کارٹون دکھائے جاتے ہیں اور ان میں ایسی شکلیں دکھائی جاتی ہیں جن کا دنیا میں کہیں وجود نہیں ہے اس طرح کے معلوماتی فلم دیکھنے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔

جواب:- آپ کے خط کو پڑھ کر ایک آدمی اندازہ کر سکتا ہے کہ دینی حس رکھنے والے مسلمان کو دارالکفر کے قیام میں کیسی کیسی زحمتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اور اس سے آدمی کی سمجھ میں یہ بات بھی آسکتی ہے کہ ہمارے فقہاء نے مسلمانوں کے لیے دارالکفر میں رہنے اور شادی بیاہ کرنے کو کیوں مکروہ کہا تھا۔ اور کس لئے یہ شرط لگائی تھی کہ اگر کوئی شخص بضرورت وہاں جا کر رہے تو کم از کم سال میں ایک مرتبہ ضرور دارالاسلام واپس آئے۔ آپ نے جن مشکلات کا ذکر کیا ہے ان کا حل مختصراً ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

۱- جہاں بیٹھ کر پیشاب کرنا ممکن نہ ہو وہاں کھڑے ہو کر کرنے میں مضائقہ نہیں۔ اگر احتیاط برتی جائے تو کپڑے چھینٹوں سے بچائے جا سکتے ہیں۔ اگر باہر کہیں رفع حاجت کر کے پانی استعمال کرنا ممکن نہ ہو تو کاغذ استعمال کر لیں اور بعد میں قیام گاہ پر آ کر پانی سے استنجا کریں۔ وضو اگر باہر کرنا پڑے اور پاؤں دھونے ممکن نہ ہوں تو جرابوں پر یا جرابوں سمیت جوتے پر مسح کر لیں۔ نماز پڑھنے کے لیے اس امر کے علم کی ضرورت نہیں ہے کہ جگہ پاک ہے۔ بلکہ ہر خشک جگہ کو پاک ہی سمجھنا چاہیئے جب تک کہ اُس کے ناپاک ہونے کا علم نہ ہو۔ اس لئے محض شک اور وہم کی بنا پر نماز قضا کرنا درست نہیں۔ اگر طبیعت کا وہم دور نہ ہو تو اپنا ہی کوٹ اتار کر کہیں بچھا لیجیے اور اس پر پڑھ لیجے۔

۲- کتوں سے اُس ملک میں بچنا سخت مشکل ہے۔ آپ اگر کوشش کے باوجود نہ بچ سکیں تو جس جگہ ان کا منہ لگ گیا ہو وہاں وضو کرتے وقت رفع وسواس کے لیے بس پانی کے چھینٹے دے لیا کیجیے۔

۳- عورتوں سے ملاقات کے وقت بہت شائستگی سے کہہ دیا کیجیے کہ ہماری تہذیب میں عورتوں سے ہاتھ ملانا معیوب ہے اس لیے آپ بُرا نہ مانیں اگر میں ہاتھ نہ ملاؤں۔ غضِ بصر کے معنی نگاہ نیچی

کرنے کے نہیں بلکہ نگاہ بچانے کے ہیں۔ آپ خواہ مخواہ گھور کر کسی خاتون کو نہ دیکھیں۔ ایک نگاہ پڑ جائے تو پھر دوسری بار نگاہ نہ ڈالیں۔ نگاہ کو بچانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ صرف نظر کے زاویے کو تھوڑا سا بدل لینا کافی ہو جاتا ہے۔

۴۔ جس سینما میں علمی یا واقعاتی فلم دکھائے گئے ہوں اس کے دیکھنے میں مضائقہ نہیں۔ ہمارے ملک میں تو سینما ہاؤس جانا بجائے خود ایک موضع تہمت ہے، اس لیے علمی اور واقعاتی فلم دیکھنے کے لیے بھی اس خرابات میں قدم نہیں رکھا جا سکتا۔ انگلستان میں آپ چاہیں تو اس طرح کے فلم دیکھیں۔

جرابوں پر مسح

سوال۔ موزوں اور جرابوں پر مسح کے بارے میں علماء میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ میں آج کل تعلیم کے سلسلے میں سکاٹ لینڈ کے شمالی حصے میں مقیم ہوں۔ یہاں جاڑے کے موسم میں سخت سردی پڑتی ہے اور اونی جراب کا ہر وقت پہننا ناگزیر ہے۔ کیا ایسی جراب پر بھی مسح کیا جا سکتا ہے؟ براہ نوازش اس بارے میں اپنی تحقیق احکام شریعت کی روشنی میں تحریر فرمائیں۔

جواب:۔ جہاں تک چمڑے کے موزوں پر مسح کرنے کا تعلق ہے اس کے جواز پر قریب قریب تمام اہل سنت کا اتفاق ہے۔ مگر سوتی اور اونی جرابوں کے معاملہ میں عموماً ہمارے فقہاء نے یہ شرط لگائی ہے کہ وہ موٹی ہوں، اور شفاف نہ ہوں کہ ان کے نیچے سے پاؤں کی جلد نظر آئے، اور وہ کسی قسم کی بندش کے بغیر خود قائم رہ سکیں۔

میں نے اپنی امکانی حد تک یہ تلاش کرنے کی کوشش کی کہ ان شرائط کا ماخذ کیا ہے۔ مگر سنت میں ایسی کوئی چیز نہ مل سکی۔ سنت سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جرابوں اور جوتوں پر مسح فرمایا ہے۔ نسائی کے سوا کتب سنن میں اور مسند احمد میں مغیرہ بن شعبہ کی روایت موجود ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا اور مسح علی الجوربین والنعلین (اپنی جرابوں اور جوتوں پر مسح فرمایا)

ابو داؤد کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، براءؓ بن عازبؓ، انسؓ بن مالک، ابو امامہؓ، سہلؓ بن سعد اور عمروؓ بن حریث نے جرابوں پر مسح کیا ہے۔ نیز حضرت عمرؓ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہ فعل مروی ہے۔ بلکہ بیہقی نے ابن عباس اور انس بن مالک سے اور طحاوی نے اوس ابن ابی اوس سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ حضورؐ نے صرف جوتوں پر مسح فرمایا ہے۔ اس میں جرابوں کا ذکر نہیں ہے۔ اور یہی عمل حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے۔ ان مختلف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف جراب اور صرف جوتے، اور جرابیں پہنے ہوئے جوتے پر مسح کرنا بھی اسی طرح جائز ہے جس طرح چمڑے کے موزوں پر مسح کرنا۔ ان روایات میں کہیں یہ نہیں ملتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فقہاء کی تجویز کردہ شرائط میں سے کوئی شرط بیان فرمائی ہو، اور نہ یہی ذکر کسی جگہ ملتا ہے کہ جن جرابوں پر حضورؐ نے اور مذکورہ بالا صحابہ نے مسح فرمایا وہ کس قسم کی تھیں۔ اس لیے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ فقہاء کی عائد کردہ ان شرائط کا کوئی ماخذ نہیں ہے۔ اور فقہاء چونکہ شارع نہیں ہیں، اس لئے ان کی شرطوں پر اگر کوئی عمل نہ کرے تو وہ گنہ گار نہیں ہو سکتا۔

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کی رائے یہ ہے کہ جرابوں پر اس صورت میں آدمی مسح کر سکتا ہے جبکہ آدمی جوتے اوپر سے پہنے رہے۔ لیکن اوپر جن صحابہ کے آثار نقل کیے گئے ہیں ان میں سے کسی نے بھی اس شرط کی پابندی نہیں کی ہے۔

مسح علی الخفین کے مسئلے پر غور کرکے میں نے جو کچھ سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ دراصل یہ تیمم کی طرح ایک سہولت ہے جو اہل ایمان کو ایسی حالتوں کے لیے دی گئی ہے جبکہ وہ کسی صورت سے پاؤں ڈھانکے رکھنے پر مجبور ہوں اور بار بار پاؤں دھونا ان کے لیے موجب نقصان یا موجب مشقت ہو۔ اس رعایت کی بنا اس مفروضے پر نہیں ہے کہ طہارت کے بعد موزے پہن لینے سے پاؤں نجاست سے محفوظ رہیں گے اس لیے ان کو دھونے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ بلکہ اس کی بنا اللہ کی رحمت ہے جو بندوں کو سہولت عطا کرنے کی مقتضی ہوئی۔ لہٰذا ہر وہ چیز جو سردی سے، یا راستے کے گرد و غبار سے بچنے کے لیے یا پاؤں کے کسی زخم کی حفاظت کے لیے آدمی پہنے اور جس کے بار بار اتارنے اور پھر پہننے میں آدمی کو زحمت ہو، اس پر مسح کیا جا سکتا ہے خواہ وہ اونی جراب ہو یا سوتی چمڑے کا جوتا

ہو یا کہ پچ کا یا کوئی کپڑا ہی موجو پاؤں پر لپیٹ کر باندھ لیا گیا ہو۔

میں جب کبھی کسی کو وضو کے بعد مسح کے لیے پاؤں کی طرف ہاتھ بڑھاتے دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا یہ بندہ اپنے خدا سے کہہ رہا ہے کہ "حکم ہو تو ابھی یہ موزے کھینچ لوں اور پاؤں دھو ڈالوں، مگر چونکہ سرکار ہی نے رخصت عطا فرمادی ہے اس لیے مسح پر اکتفا کرتا ہوں"۔ میرے نزدیک، در اصل یہی معنی مسح علی الخفین وغیرہ کی حقیقی روح ہیں اور اس روح کے اعتبار سے وہ تمام چیزیں یکساں ہیں جنہیں ان ضروریات کے لیے آدمی پہنے جن کی رعایت ملحوظ رکھ کر مسح کی اجازت دی گئی ہے۔

قطبین کے قریب مقامات میں نماز اور روزے کے اوقات

سوال:۔ میرا ایک لڑکا ٹریننگ کے سلسلے میں انگلستان گیا ہوا ہے۔ آج کل وہ ایک ایسی جگہ قیام رکھتا ہے جو قطبِ شمالی سے بہت قریب ہے۔ وہ نمازوں اور روزوں کے اوقات کے لیے ایک اصولی ضابطہ چاہتا ہے۔ بارش، بادل اور دھند کی کثرت سے وہاں سورج بالعموم بہت کم دکھائی دیتا ہے۔ کبھی دن بہت بڑے ہوتے ہیں کبھی بہت چھوٹے۔ بعض حالات میں طلوع آفتاب اور غروب آفتاب میں بیس گھنٹے کا فصل ہوتا ہے تو کیا ایسی صورت میں بیس گھنٹے یا اس سے زائد کا روزہ رکھنا ہوگا؟

جواب:۔ جن ممالک میں چوبیس گھنٹے کے اندر طلوع و غروب ہوتا ہے ان میں خواہ دن اور رات چھوٹے ہوں یا بڑے، نمازوں اور روزوں کے اوقات انہی قاعدوں پر مقرر کیے جائیں گے جو قرآن اور حدیث میں بتائے گئے ہیں۔ یعنی فجر کی نماز طلوع آفتاب سے پہلے، ظہر کی نماز زوال آفتاب کے بعد، عصر کی نماز غروب آفتاب سے قبل، مغرب کی نماز غروب آفتاب کے بعد اور عشاء کی نماز کچھ رات گزر جانے پر۔ اسی طرح روزہ بہرحال صبح صادق کے ظہور پر شروع ہوگا اور غروب آفتاب کے معاً بعد افطار کیا جائے گا۔ جہاں ظہر و عصر یا مغرب و عشاء میں فصل ممکن نہ ہو وہاں جمع بین الصلوٰتین کر لیں۔

آپ کے صاحبزادے اپنی سہولت کے لیے انگلستان کی رصدگاہ سے دریافت کرلیں کہ ان کے علاقے میں آفتاب کے طلوع و غروب اور زوال کے اوقات کیا ہیں۔ پھر ان اوقات کے لحاظ سے اپنی نمازوں کے اوقات مقرر کرلیں۔

روزے کے لیے وہاں کے دن کی بڑائی سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ابن بطوطہ نے روس کے شہر بلغار کے متعلق لکھا ہے کہ گرمی کے زمانے میں جب وہ وہاں پہنچا ہے تو رمضان کا مہینہ تھا اور افطار کے وقت سے لے کر صبح صادق کے ظہور تک صرف دو گھنٹے کا وقت ملتا تھا۔ اسی مختصر مدت میں وہاں کے مسلمان افطار بھی کرتے، کھانا بھی کھاتے اور عشاء کی نماز بھی پڑھ لیتے تھے۔ نماز عشاء سے فارغ ہو کر کچھ دیر نہ گزرتی تھی کہ صبح صادق ظاہر ہو جاتی اور پھر فجر کی نماز پڑھ لی جاتی تھی۔

پوتے کی وراثت اور مسئلہ غلامی

سوال:۔ ترجمان مارچ ۵۲ء میں پوتے کی محرومیٔ وراثت کے بارے میں آپ کا جواب سائل کی تشفی تحقیق کو فرد نہیں کرتا۔ میری رائے میں آپ کا یہ فقرہ کہ "اس میں شیعوں کے سوا کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا ہے" صحیح نہیں۔ جہاں تک بحیثیت قانون داں کے میری معلومات ہیں، اس مسئلے میں شیعوں نے بھی اختلاف نہیں کیا۔ اُن کے ہاں بھی تعیین ورثاء کے بعد یہی اصول کارفرما رہے گا کہ قریب کا وارث دور کے وارث کو حق وراثت سے محروم کر دے گا۔ ان کے نزدیک بھی متوفی لڑکے کا لڑکا اپنے چچا کی موجودگی میں وراثت سے محروم رہے گا۔ جو وجوہ آپ نے اس مسئلے کی صحت کے بارے میں ارشاد فرمائی ہیں مجھے ان سے اتفاق ہے۔ اُن کے علاوہ میرے نزدیک مندرجہ ذیل دلائل بھی اس کے حق میں ہیں

(الف) اپنے محدود قانونی مفہوم میں ایک خاندان صرف میاں، بیوی اور ان کی اولاد پر ہی مشتمل ہوتا ہے۔ لڑکے یا لڑکی کی جب شادی ہوتی ہے تو وہ ایک نئے خاندان

کی بنا ڈالتے ہیں۔ اس لحاظ سے پوتا دادا کے خاندان سے الگ ہوتا ہے اور وہ دادا کے لڑکوں کی موجودگی میں حصہ پانے کا حقدار نہیں۔

(ب) کسی جزئی دقت یا اشکال کی خاطر مبادیات اور اصولی نظریات کا ترک کرنا درست نہیں ہے۔ یتیم پوتے کی محرومیٔ وراثت خواہ بظاہر کسی قدر پریشان کن ہی کیوں نہ ہو محض اس کی خاطر اسلامی قانون وراثت کے اصول کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔ مروجہ قانون میں پوتے کے وارث ہونے کی وجہ سے اس بارے میں اسلامی قانون وراثت کے اس جزئیے پر اشکال محسوس ہوتا ہے لیکن خود موجودہ قانون میں بیسیوں ایسے اشکالات موجود ہیں۔

میرا ایک سوال غلامی کے بارے میں بھی ہے۔ غلامی سے متعلق ضوابط تو ایسے قائم کیے گئے کہ جن میں اس کے مفقود ہونے کا رجحان پایا جاتا ہے لیکن اسے یک قلم ممنوع کیوں نہیں کر دیا گیا؟

(جواب) شیعہ قانون کے متعلق میری واقفیت بہت محدود ہے۔ ان کی فقہ اور احادیث کا میں نے باقاعدہ مطالعہ نہیں کیا ہے۔ البتہ اہل سنت کی بعض فقہی کتابوں میں اشارۃً یہ بات کہیں نگاہ سے گزری تھی کہ وراثت کے متعدد مسائل میں ہمارے اور ان کے درمیان اختلاف ہے، جن میں سے ایک اس مسئلے کو بھی گنایا گیا تھا۔ اسی بنا پر میں نے شک کے ساتھ لکھ دیا تھا کہ غالباً ان کے سوا کسی نے پوتے کی وراثت کے مسئلے میں اختلاف نہیں کیا ہے۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے اصل صورت حال سے آگاہ فرمایا۔

میں نے پوتے کی وراثت کے معاملے میں تمام دلائل بیان کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بلکہ صرف اختصار کے ساتھ یہ بتایا تھا کہ اس مسئلے میں جذبات کی بنا پر فیصلہ کرنے کے بجائے اگر معقول اصولوں کی بنا پر غور کیا جائے تو جو کچھ فقہاء نے بالاجماع رائے قائم کی ہے وہی سراسر معقول معلوم ہوتی ہے۔ میرے بیان کردہ دلائل پر مزید بہت سے دلائل کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر

خصوصیت کے ساتھ جو بات اس معاملہ میں سب سے زیادہ وزنی ہے وہ یہ ہے کہ سلف سے لے کر خلف تک تمام امت کے اہل علم اس پر متفق رہے ہیں۔ ایسے متفق علیہ مسائل کا متفق علیہ ہونا ہی بجائے خود اپنے اندر اتنا وزن رکھتا ہے کہ کوئی معقول آدمی ان سے اختلاف کی اسوقت تک جرأت نہیں کرسکتا جبتک کہ اس کے پاس دلائل کی کوئی بڑی غیر معمولی طاقت نہ ہو اور یہاں حال یہ ہے کہ جن لوگوں نے اختلاف کی جرأت کی ہے، ایک طرف تو اُن کے دلائل ایسے قوی نہیں ہیں کہ ان کی بنا پر امت کے ایک متفق علیہ مسئلے میں تغیر کیا جاسکے، اور دوسری طرف وہ قریب قریب سب کے سب کچھ ایسے ٹیڑھے ذہن کے لوگ ہیں جو ہر دینی مسئلے میں ہمیشہ ایک نرالی اینچ کی بات نکالا کرتے ہیں۔ ان کی بات اگر مانی جائے تو ہمیں گویا یہ ماننا پڑیگا کہ اسی ایک مسئلے میں نہیں بلکہ پورے دین کے سمجھنے میں پہلی صدی سے لے کر آج تک ساری امت غلطی کرتی رہی ہے اور دین کو اگر سمجھا ہے تو صرف اِس دور کے تین چار آدمیوں نے سمجھا ہے۔ اس طرح کے خبطیوں کی بات آخر کس التفات کی مستحق ہوسکتی ہے؟

غلامی کے بارے میں آپ نے جو سوال کیا ہے اس کا جواب آپ کو بآسانی مل جاتا اگر آپ تفہیمات حصہ دوم اور رسائل و مسائل میں میری تصریحات ملاحظہ فرمالیتے۔ غلامی کو بالکل موقوف نہ کر دینے کی وجہ یہ ہے کہ اسلام نے اسے محض ایک جنگی ضرورت کی حیثیت سے باقی رکھا ہے، اور یہ ضرورت ہر ایسے موقع پر پیش آسکتی ہے جبکہ ہمارا کسی دشمن سے اسیرانِ جنگ کے مبادلے یا فدیے پر معاہدہ نہ ہوسکے اور ہماری حکومت جنگی قیدیوں کو بلا فدیہ و بلا مبادلہ چھوڑ دینا ملی مصالح کے خلاف سمجھے۔ شاذ مواقع سے قطع نظر کرکے دیکھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں اٹھارویں صدی عیسوی کے اختتام تک اسیرانِ جنگ کے مبادلے کا طریقہ رائج نہ تھا نہ اس امر کا کوئی امکان تھا کہ مسلمان حکومتیں دشمن کے جنگی قیدیوں کو چھوڑ کر اپنے جنگی قیدیوں کو بھی چھڑا سکتیں۔ اور اب بھی اگر دنیا میں مبادلہ اسیرانِ جنگ کا طریقہ رائج ہوا ہے تو وہ کسی مذہبی حکم کی بنا پر نہیں بلکہ ایک مصلحت کی بنا پر ہے جسے کوئی قوم جب چاہے نظر انداز کرسکتی ہے۔ آج یہ ناممکن نہیں ہے کہ ہمارا کسی ایسے ہٹ دھرم دشمن سے سابقہ پیش آجائے جو مبادلہ اسیران کی تجویز کو ٹھکرا دے اور ہمارے جنگی قیدیوں کو کسی شرط پر بھی چھوڑنے کے لیے راضی

نہ ہو۔ اب آپ خود سوچیں کہ اگر اسلام ہمیں بہر حال جنگی قیدیوں کی رہائی کا پابند کر دیتا تو کیا یہ حکم ہمارے لیے وجہ مصیبت نہ بن جاتا؟ کیا کوئی قوم بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس نقصان کی متحمل ہو سکتی ہے کہ ہر لڑائی میں اس کے آدمی دشمن کے پاس قید ہوتے رہیں اور وہ دشمن کے آدمیوں کو چھوڑتی چلی جائے؟ اور کیا کوئی دشمن بھی ایسا بیوقوف ہو سکتا ہے کہ وہ ہم سے کبھی اسیران جنگ کے مبادلے کا معاہدہ کرنے پر آمادہ ہو جبکہ اسے یہ اطمینان ہو کہ ہم بہر حال اپنے مذہبی احکام کی بنا پر اس کے آدمیوں کو چھوڑنے پر مجبور ہیں؟

اس سلسلہ میں ایک سوال پر اور بھی غور کر لیجیے کسی شخص کو عمر بھر جیل میں رکھنا یا اس سے جبری محنت (Forced Labour) لینا اور اسے موجودہ دور کے انسانی باڑوں (Concentration Camps) میں رکھنا آخر کس دلیل کی بنا پر غلامی سے بہتر سمجھا جا سکتا ہے؟ غلامی میں تو نسبتہً اس سے زیادہ آزادی حاصل رہتی ہے، آدمی کو شادی بیاہ کا موقع بھی مل جاتا ہے، ایک آدمی کو براہ راست ایک آدمی سے واسطہ پڑتا ہے جس میں زیادہ انسانی سلوک کا امکان ہے، اور ایک غلام اپنے آقا کو خوش کر کے یا اسے فدیہ دے کر آزادی بھی حاصل کر سکتا ہے۔ پہلے ذرا اس سلوک کا مطالعہ کر لیجیے جو روس اور جرمنی میں دشمن کے جنگی قیدیوں ہی کے ساتھ نہیں خود اپنے ملک کے سیاسی "مجرمین" کے ساتھ بھی کیا گیا ہے اور کیا جا رہا ہے۔ پھر فیصلہ کیجیے کہ اگر کبھی کسی ایسے دشمن سے ہمیں سابقہ پیش آ جائے اور وہ ہمارے جنگی قیدیوں کے ساتھ یہ سلوک کرنے لگے تو اس کے جواب میں ہم کو بھی یہی وحشیانہ سلوک کرنا چاہیے یا اس سے بہتر اور زیادہ مبنی بر انسانیت وہ سلوک ہے جو اسلام نے ہم کو غلاموں کے ساتھ کرنے کی اجازت اور ہدایت دی ہے؟

شادی بیاہ میں کفاءت کا لحاظ

سوال:- ترجمان ذی القعدہ و ذی الحجہ ۶۰ھ میں مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کے جواب

میں ایک جگہ آپ نے ایسے تسامح سے کام لیا ہے جو ناقابلِ برداشت ہے۔ مولانا موصوف نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ "کیا ایک سید ہندوستان میں رہنے کی وجہ سے سید نہ رہے گا، بلکہ جلاہا بن جائے گا؟" میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ آپ نے بھی جواب میں دبی زبان سے اس غیر اسلامی امتیاز کو یہ کہہ کر تسلیم کر لیا کہ "دار الکفر کے ایک سید صاحب، دار الاسلام کی ایک سیدانی کے باعتبار نسب کفو ہی سہی"۔ آپ کے الفاظ مبہم ہیں۔ کیا آپ بھی مسئلہ کفو کو اسلام میں جائز سمجھتے ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو آپ قرآن و حدیث سے استشہاد پیش فرما کر میرا اطمینان فرمائیں۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ دنیا کے کام کاج اور پیشوں کو انسانیت کی اونچ نیچ میں کیوں دخل ہو؟ بنی نوع انسان سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ کیا حضرت داؤد علیہ السلام نے اگر لوہے کا کام کیا ہے تو وہ لوہار ٹھہریں گے؟

جواب۔ آپ نے کفاءت کے مسئلے پر جو اعتراض کیا ہے اس سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ طرزِ تعبیر میں اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن نفسِ مسئلہ کفاءت تو عقل اور نقل دونوں سے ثابت ہے اور تفصیلات سے قطع نظر، بجائے خود نکاح میں اس کے معتبر ہونے پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔ اس مسئلے کا مأخذ متعدد احادیث ہیں۔ مثلاً:

لا تنکحوا النساء الا الاکفاء (دار قطنی، بیہقی)	عورتوں کی شادیاں نہ کرو مگر ان لوگوں کے ساتھ جو کفو ہوں۔
یا علی ثلاث لا تؤخرھا۔ الصلوٰۃ اذا اٰنت، والجنازۃ اذا حضرت، والایم اذا وجدت کفاءً (ترمذی، حاکم)	اے علیؓ تین کام ہیں جن کو ٹالنا نہ چاہیئے۔ ایک نماز جبکہ اس کا وقت آجائے۔ دوسرے جنازہ جبکہ تیار ہو جائے۔ تیسرے، بن بیاہی عورت کا نکاح جبکہ اس کے لیئے کفو مل جائے۔
تخیروا لنطفکم وانکحوا الاکفاء	اپنی نسل پیدا کرنے کے لیے اچھی عورتیں تلاش کرو اور اپنی عورتوں کے نکاح ایسے لوگوں سے کرو جو ان کے کفو ہوں (یہ حدیث حضرت عائشہ انس عمر الخطاب

رضی اللہ عنہم سے متعدد طریقوں سے مروی ہے۔

امام محمد نے کتاب الآثار میں حضرت عمرؓ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے۔

لأمنعنّ فروج ذوات الاحساب الامن الاکفاء	میں شریف گھرانوں کی عورتوں کے نکاح کفو کے سوا کہیں اور نہ کرنے دونگا۔

یہ تو ہے اس مسئلے کی نقلی دلیل۔ رہی عقلی دلیل، تو عقل کا صریح تقاضا یہ ہے کہ کسی لڑکی کو کسی شخص کے نکاح میں دیتے وقت یہ دیکھا جائے کہ وہ شخص اس کے جوڑ کا ہے یا نہیں۔ اگر جوڑ کا نہ ہو تو یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ دونوں باہم نباہ سکیں گے۔ نکاح سے مقصود تو عقلاً بھی اور نقلاً بھی یہی ہے کہ زوجین کے درمیان مودت و رحمت ہو اور وہ ایک دوسرے کے پاس سکون حاصل کر سکیں۔ آپ خود سوچ لیں کہ بے جوڑ نکاحوں سے اس مقصود کے حاصل ہونے کی کہاں تک توقع کی جا سکتی ہے؟ اور کونسا معقول انسان ایسا ہے جو اپنے لڑکے یا لڑکی کا بیاہ کرنے میں جوڑ کا لحاظ نہ کرتا ہو؟ کیا آپ اسلامی مساوات کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ ہر مرد کا ہر عورت سے اور ہر عورت کا ہر مرد سے صرف اس بنا پر نکاح کر دیا جائے کہ دونوں مسلمان ہیں بلا اس لحاظ کے کہ ان میں کوئی مناسبت پائی جاتی ہے یا نہیں؟

فقہاء نے اس جوڑ کا مفہوم متشخص کرنے کی کوشش کی ہے اور ہر ایک نے اپنے اپنے طریقے پر یہ بتایا ہے کہ لڑکی اور لڑکے کے درمیان کن کن امور میں مماثلت ہونی چاہیے۔ ہم ان تفصیلات میں بعض فقہاء سے اختلاف اور بعض سے اتفاق کر سکتے ہیں۔ مگر فی الجملہ عقل عام یہ تقاضا کرتی ہے کہ زندگی بھر کی شرکت و رفاقت کے لیے جن دو ہستیوں کا ایک دوسرے سے جوڑ ملایا جائے ان کے درمیان اخلاق، دین، خاندان، معاشرتی طور طریق، معاشرتی عزت و حیثیت، مالی حالات، ساری ہی چیزوں کی مماثلت دیکھی جانی چاہیے۔ ان امور میں اگر پوری یکسانی نہ ہو تو کم از کم اتنا تفاوت بھی نہ ہو کہ زوجین اس کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور رفاقت نہ کر سکیں۔ یہ انسانی معاشرت کا ایک عملی مسئلہ ہے جس میں حکمت عملی کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے

آدم کی ساری اولاد کے یکساں ہونے کا نظریہ آپ یہاں چلانا چاہیں گے تو لاکھوں گھر برباد کریں گے۔ ہاں اگر آپ یہ کہیں کہ محض نسل و نسب کی بنا پر ذات پات اور اونچ نیچ کا تصور ایک جاہلی تصور ہے، تو اس بات میں یقیناً میں آپ سے اتفاق کروں گا۔ جن لوگوں نے کفاءت کے فقہی مسئلے کو مسخ کر کے ہندوؤں کی طرح کچھ اونچی اور کچھ نیچی ذاتیں قرار دے رکھی ہیں ان پر مجھے بھی ویسا ہی اعتراض ہے جیسا آپ کو ہے۔

سحر کی حقیقت اور معوذتین کی شان نزول

سوال۔ معوذتین کی شان نزول کے متعلق بعض مفسرین نے حضور علیہ السلام پر یہودی لڑکیوں کے جادو کا اثر ہونا اور ان سورتوں کے پڑھنے سے اس کا زائل ہو جانا بحوالۂ احادیث تحریر فرمایا ہے۔ یہ کہاں تک درست ہے؟ نیز جادو کی حقیقت کیا ہے؟ بعض اشخاص حضور علیہ السلام پر جادو کے اثر کو منصب نبوت کے خلاف سمجھتے ہیں۔

جواب۔ شان نزول کے بارے میں یہ بات پہلے ہی سمجھ لینے کی ہے کہ مفسرین جب کسی واقعہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ آیت اس واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جب یہ واقعہ پیش آیا اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس واقعہ سے اس آیت کا تعلق ہے۔

معوذتین کے متعلق یہ بات ثابت ہے کہ وہ مکے میں نازل ہوئی ہیں اور احادیث میں جادو کا جو واقعہ بیان ہوا ہے وہ مدینہ طیبہ کا ہے۔ اس لیے یہ کہنا بداہتہً غلط ہے کہ جب جادو کا وہ واقعہ پیش آیا اس وقت یہ دونوں سورتیں نازل ہوئیں۔ دراصل اس کا مطلب یہ ہے کہ جب یہ واقعہ پیش آیا تو حضور کو ان سورتوں کے پڑھنے کی ہدایت فرمائی گئی۔

جادو کی حقیقت اگر آپ سمجھنا چاہیں تو قرآن مجید میں حضرت موسیٰ کا قصہ پڑھیں۔ جادوگروں نے

لاٹھیوں اور رسیوں کے جو سانپ بنائے تھے وہ حقیقت میں سانپ نہیں بن گئے تھے مگر اس مجمع نے جو وہاں موجود تھا یہی محسوس کیا کہ یہ لاٹھیاں اور رسیاں سانپوں میں تبدیل ہو گئی ہیں اور خود حضرت موسیٰ کی آنکھیں بھی پیغمبر کی آنکھیں ہونے کے باوجود اس قدر مسحور ہو گئیں کہ انہوں نے بھی انہیں سانپ ہی دیکھا۔ قرآن مجید کا بیان ہے کہ

فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَ اسْتَرْهَبُوْهُمْ (اعراف - ۱۴) — جب جادوگروں نے اپنے انچھر پھینکے تو لوگوں کی آنکھوں کو مسحور کر دیا اور انہیں مرعوب کر دیا۔

فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى (طٰہٰ - ۳) — پس یکایک ان کے جادو کی وجہ سے ان کی لاٹھیاں اور رسیاں موسیٰ کو دوڑتی ہوئی محسوس ہوئیں اور موسیٰ اپنے دل میں ڈر گیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جادو قلب ماہیت نہیں کرتا بلکہ ایک خاص قسم کا نفسیاتی اثر ڈال کر آدمی کے حواس کو متاثر کرتا ہے۔ نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جادو کی یہ تاثیر عام انسانوں پر ہی نہیں انبیاء پر بھی ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اس ذریعہ سے کوئی جادوگر کسی نبی کو شکست نہیں دے سکتا نہ اُس کے مشن کو فیل کر سکتا ہے اور نہ اُسے اِس حد تک متاثر کر سکتا ہے کہ وہ جادو کے زیر اثر آ کر منصب نبوت کے خلاف کوئی کام کر جائے، لیکن بجائے خود یہ بات کہ ایک نبی پر جادو کا اثر ہو سکتا ہے، خود قرآن سے ثابت ہے۔

احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر ہونے کی جو روایات آئی ہیں ان میں سے کوئی چیز بھی عقل، تجربے اور مشاہدے کے خلاف نہیں ہے اور نہ قرآن کی بتائی ہوئی اس حقیقت کے خلاف ہے جس کی میں نے اوپر تشریح کی ہے۔ نبی اگر زخمی یا شہید ہو سکتا ہے تو اس کا جادو سے متاثر ہو جانا کونسی تعجب کی بات ہے؟ روایات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ چند روز تک حضور کو کچھ نسیان سا لاحق ہو گیا تھا اور وہ بھی تمام معاملات میں نہیں بلکہ بعض معاملات میں جزوی طور پر۔

قصاص اور دیت

سوال: قصاص اور دیت کے بارے میں چند استفسارات تحریرِ خدمت ہیں۔ ان کے جوابات ارسال فرمائیں:

(ا) مقتول کے وَرَثہ میں سے کوئی ایک وارث دیت لے کر یا بغیر دیت لیے اگر اپنا حق قاتل کو معاف کر دے تو کیا سزائے موت معاف ہو سکتی ہے؟ اس میں اقلیت و اکثریت کا کوئی لحاظ رکھا جا سکتا ہے یا نہیں؟ مثلاً تین بیٹوں میں سے ایک نے قصاص معاف کر دیا، باقی دو قصاص لینے پر مُصر ہیں تو قاضی کو کیا شکل اختیار کرنا ہوگی؟

(ب) اگر مقتول کے وَرَثہ دیت لینے پر آمادہ ہیں لیکن قاتل اپنی غربت کے باعث مطلوبہ دیت کی ادائیگی سے قطعاً معذور ہے، تو کیا قاضی اُس کے وَرَثہ کو دیت ادا کرنے پر مجبور کر سکتا ہے؟ اگر کر سکتا ہے، تو کیا اس سے ورثہ کو بے گناہ سزا نہیں مل رہی ہے؟

(ج) اگر مقتول کے ورثہ ہی نہیں ہیں یا اگر ہیں تو وہ اتنے مفلس ہیں کہ دیت ادا کرنا چاہیں بھی تو نہیں ادا کر سکتے، تو کیا ایسی صورت میں قاتل کو قصاص یا دیت کے متبادل سزا (از قسم حبس و مشقت وغیرہ) تجویز ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیا صورت اختیار کی جائیگی؟

(د) موجودہ قانون میں ہائی کورٹ میں اپیل کے بعد بھی اگر قاتل کو پھانسی کی سزا تجویز ہو جائے تو پھر صدرِ حکومت یا گورنر جنرل کے سامنے رحم کی اپیل ہوتی ہے جس میں سزا کے تغیّر کا امکان رہتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ صورت کس حد تک جائز ہے؟

جواب: مقتول کے ورثہ میں سے کوئی ایک بھی اگر قاتل کو اپنا حق معاف کر دے یا دیت لینا قبول کر لے تو قصاص لازماً ساقط ہو جائے گا اور باقی وارثوں کو دیت پر راضی ہونا پڑے گا۔ اس معاملہ میں اکثریت و اقلیت کا سوال اٹھانا صحیح نہیں ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ جس وارث نے عفو یا قبولِ دیت کے ذریعہ سے قاتل کو زندہ رہنے کی اجازت دی ہے، اس کی اجازت آخر

قصاص کی صورت میں کیسے نافذ ہو سکتی ہے؟ مثال کے طور پر اگر تین وارثوں میں سے ایک نے قاتل کو معاف کر دیا، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ مقتول کی جان کے ایک تہائی حصہ کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہو گیا۔ اب کیا یہ ممکن ہے کہ باقی دو وارثوں کے مطالبے پر صرف دو تہائی جان لی جا سکے اور ایک تہائی جان کو زندہ رہنے دیا جائے؟ اگر یہ ممکن نہیں ہے تو لامحالہ باقی دونوں وارثوں کو قبولِ دیت پر مجبور ہونا پڑے گا۔ یہی رائے ہے جو حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے اس طرح کے ایک مقدمہ میں ظاہر کی تھی اور حضرت عمرؓ نے اسی پر فیصلہ فرمایا۔ چنانچہ مبسوط میں ہے، قال ابن مسعود اریٰ ھذا قد احیا بعض نفسہ فلیس للآخران یتلفہ فامضی عمر القضاء علی رأیہ (ج ۲۶ ص ۱۵۸)۔ ابنِ مسعود نے کہا کہ میرے نزدیک ایک وارث نے جب قاتل کی جان کے ایک حصے کو حقِ حیات بخش دیا تو دوسرے کو اسے تلف کرنے کا حق نہ رہا۔ اسی رائے پر حضرت عمر نے فیصلہ فرما دیا"۔

(ب) قاضی یقیناً یہ حق رکھتا ہے کہ قاتل کے اولیاء کو دیت ادا کرنے پر مجبور کرے۔ حمل بن مالک والی روایت میں صاف مذکور ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اولیاء قاتل کو خطاب فرمایا "قُومُوا فَدُوهُ" اٹھو اور دیت ادا کرو"۔ اس حدیث سے یہ بات تو ثابت ہو جاتی ہے کہ دیت ادا کرنے کی ذمہ داری میں قاتل کے ساتھ اس کے اولیاء بھی شریک ہیں، البتہ اس امر میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے کہ دیت ادا کرنے کے معاملے میں قاتل کے اولیاء (یا عاقلہ) کن لوگوں کو قرار دیا جائے گا؟ شافعیہ کے نزدیک "عاقلہ" سے مراد ورثہ یا عصبہ ہیں اور حنفیہ کے نزدیک وہ تمام لوگ عاقلہ ہیں جو زندگی کے معاملات میں ایک شخص کے پشت پناہ اور سہارا بنتے ہوں، خواہ وہ رشتہ دار ہوں، یا ہم پیشہ برادری والے، یا وہ لوگ جو عہد و پیمان کی بنا پر ایک دوسرے کی مدد کرنے کے پابند ہوں۔ شافعیہ نے جو رائے دی ہے وہ صرف اُس معاشرے کے لیے موزوں ہے جس میں قبائلی سسٹم رائج ہو، لیکن حنفیہ کی رائے اُن معاشروں میں بھی چل سکتی ہے جن میں قبیلے کے بجائے دوسرے نسبی، یا معاشی، یا تمدنی روابط کی بنا پر لوگ ایک دوسرے کے پشت

پناہ بنتے ہوں۔ حنفیہ کی رائے کے مطابق ایک سیاسی پارٹی بھی اپنے ایک فرد کی عاقلہ بن سکتی ہے کیونکہ اس کے ارکان زندگی کے اہم معاملات میں ایک دوسرے کے حامی و مددگار ہوتے ہیں اور بڑی حد تک ایک دوسرے کی ذمہ داریوں میں شریک سمجھے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب معاشرے کی بنیادیں قبائلی نظام کی بہ نسبت زیادہ وسیع ہو گئیں تو حضرت عمرؓ نے ایک فوجی کی دیت کا ذمہ دار اُس کے پورے لشکر کو ٹھیرا لیا۔ چنانچہ فتح القدیر میں ہے فانه لما دون الدواوین جعل العقل علی اهل الدیوان وکان ذالك بمحضر من الصحابة رضی الله عنهم من غیر نکیر منهم (ج ۸ ص ۴۰۶) "حضرت عمرؓ نے جب عسکری نظام قائم کیا تو دیت کو پورے اہلِ لشکر پر عائد کیا۔ آپ کا یہ فعل صحابہ کی ایک مجلس میں انجام دیا گیا اور انہوں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔"

رہا آپ کا یہ سوال کہ اولیا، یا عاقلہ پر دیت عائد کرنا گنہ گار کی سزا بے گناہوں کو دینے کا ہم معنی تو نہیں ہے؟ تو اس کا جواب آپ خود پا لیتے اگر اس امر پر غور فرماتے کہ ایک شخص اجتماعی زندگی کے اندر رہتے ہوئے قتل جیسے اجتماع کُش فعل کا ارتکاب بالعموم اپنے حامیتوں کے بل بوتے پر ہی کیا کرتا ہے۔ اگر وہ لوگ جن کی حمایت اور پشتیبانی پر وہ بھروسہ رکھتا ہے یہ جان لیں کہ اس کی ایسی حرکات کی ذمہ داری میں وہ بھی شریک ہونگے تو اُسے قابو میں رکھنے کی خود کوشش کریں گے اور اسے ایسی چھوٹ نہ دینگے کہ وہ دوسروں کی جانیں لیتا پھرے۔ کیا عجب ہے کہ دیت کے ذمہ دار اولیا کے لیے "عاقلہ" کا لفظ اسی رعایت سے اختیار کیا گیا ہو۔ عقل کے معنی آپ جانتے ہی ہیں کہ روکنے اور باندھنے کے ہیں۔ شاید اسلام نے اس لفظ کو اختیار کرنے میں یہی مناسبت پیش نظر رکھی ہو یہ وہ لوگ ہیں جن کا کام یہ ہے کہ آدمی کو قابو میں رکھیں اور ایسا بے قابو نہ ہونے دیں کہ وہ قتل و غارت کا ارتکاب کرنے لگے۔

(ج) اگر قاتل ایک لاوارث آدمی ہو یا اسکا قریب ترحلقۂ اولیا دیت ادا کرنے کے قابل نہ ہو تو اس صورت میں صحیح یہ ہے کہ اسکی دیت کا بوجھ وسیع تر حلقۂ اولیا پر ڈالا جائے حتّیٰ کہ بالآخر اسکا بوجھ ریاست کے خزانے پر پڑنا چاہیے کیونکہ ایک شہری کا وسیع تر عاقلہ اسکی ریاست ہی ہے۔ اس قول کا ماخذ وہ حدیث ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رئیس مملکت ہونیکی حیثیت سے فرمایا ہے:۔ من ترك كلاً فالیّ ومن ترك مالاً فلورثته وانا وارث من لاوارث له، اعقل له وارثه (ابوداؤد۔ کتاب الفرائض) (اگر۔

کوئی شخص بے سہارا اہل و عیال چھوڑے تو ان کی کفالت میرے ذمے ہے اور اگر کوئی مال و دولت چھوڑے تو وہ اس کے ورثہ کیلیے ہے اور میں لاوارث کا وارث ہوں اسکی طرف سے دیت بھی دونگا اور اس کا ورثہ بھی بنوں گا)

اس حدیث کی رو سے ریاست ہر اس شہری کی وارث ہے جو لاوارث مر گیا ہو اور ہر اس شہری کی عاقلہ ہے جسکی دیت ادا کرنے والا کوئی نہ ہو۔ خود عقل کی رو سے بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے کیونکہ ریاست ملک میں امن کی ذمہ دار ہے، اگر وہ قتل کو روکنے میں ناکام رہی ہے تو مقتول کے وارثوں کے نقصان کی تلافی یا تو اسے قاتل کے وارثوں اور حامیوں سے کرانی چاہیے یا پھر خود کرنی چاہیے۔

دیت ادا نہ کر سکنے کی صورت میں قاتل کو کوئی متبادل سزا دینے کا ثبوت کتاب و سنت میں مجھے کہیں نہیں ملا نہ اس بارے میں سلف سے کوئی معتبر قول منقول ہوا ہے۔

(د) یہ بات اسلامی تصورِ عدل کے خلاف ہے کہ عدالتی فیصلے کے بعد کسی کو سزا کے معاف کرنے یا بدلنے کا اختیار حاصل ہو۔ عدالت اگر قانون کے مطابق فیصلہ کرنے میں غلطی کرے تو امیر یا صدر حکومت کی مدد کیلیے پریوی کونسل طرز کی ایک آخری عدالتِ مرافعہ قائم کی جا سکتی ہے جس کے مشورے سے وہ اُن بے انصافیوں کا تدارک کر سکے جو نیچے کی عدالتوں کے فیصلوں میں پائی جاتی ہوں۔ مگر مجرد "رحم" کی بنا پر عدالت کے فیصلوں میں ردّ و بدل کرنا اسلامی نقطہ نظر سے بالکل غلط ہے۔ یہ اُن بادشاہوں کی نقالی ہے جو اپنے اندر کچھ شانِ خدائی رکھنے کے مدعی تھے یا دوسروں پر اس کا مظاہرہ کرنا چاہتے تھے۔

اہلِ سنت اور اہلِ تشیّع کا اختلاف

سوال: میں نے ایک دیندار شیعہ عزیز کی وساطت سے مذہب شیعہ کی بکثرت کتب کا مطالعہ کیا ہے شیعہ سنی اختلافی مسائل میں سے جو اختلاف نماز کے بارے میں ہے وہ میرے لیے خاص طور پر تشویش کا باعث بن گیا ہے۔ میں اپنے شکوک آپ کے سامنے رکھتا ہوں اور آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ تفصیلی جواب کے ذریعے انکا ازالہ فرمائیں۔

میرے شبہات نماز کی ہیئت قیام سے متعلق ہیں۔ نماز اولین رکنِ اسلام ہے لیکن حیرت ہے کہ قیام میں ہاتھ باندھنے یا چھوڑ دینے کے بارے میں ائمہ اربعہ کے مابین اختلاف ہے اور پھر افسوس اس امر کا ہے کہ

ارشاد نبوی "انی تارک فیکم الثقلین ..... کتاب اللہ وعترتی" کے باوجود ائمہ اہل سنت نے رفع اختلاف کیلیے اہل بیت کیطرف رجوع نہیں کیا حالانکہ امام اعظمؒ اور امام مالکؒ امام جعفر صادقؒ کے معاصر بھی تھے۔ اس طرح رسول کے گھر والوں کو چھوڑ کر دین کے سارے کام کو غیر اہل بیت پر منحصر کر دیا گیا اور مسائل دین میں اہل بیت سے تمسک کرنا تو درکنار ان سے احادیث تک نہیں روایت کی گئیں حالانکہ بقول "صاحب البیت ادری بما فی البیت" دین کا اصل منبع ائمہ اہل بیت تھے۔ امام ابوحنیفہؒ و مالکؒ کا انحصار محض روایات پر تھا۔ برعکس اس کے امام جعفر صادقؒ نے اپنے والد امام باقرؒ کو انہوں نے زین العابدینؒ کو اور انہوں نے حسینؓ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ وہ قیام میں کیسے کھڑے ہوتے تھے۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ ائمہ اہل بیت کی طرف اسی عدم رجوع کا نتیجہ ہے جو اہل سنت کے اختلافات کی شکل میں رونما ہوا ہے

جواب۔ آپ کا سوال تو صرف نماز کے بارے میں ہے مگر آپ نے اسکے متعلق اپنی الجھن کی جن بنیادوں کا ذکر کیا ہے جب تک انہیں دور نہ کیا جائے آپ کی الجھن دور ہونی مشکل ہے۔ اسلیے میں پہلے مختصراً ان بنیادوں پر بحث کرونگا۔

آپ کی الجھن کا نقطۂ آغاز یہ حدیث ہے کہ انی تارک فیکم الثقلین ..... الخ۔ اس کے متعلق آپ کو سب سے پہلے تو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ حدیث مختلف الفاظ میں مختلف سندوں سے روایت ہوئی ہے جن میں سے بعض ضعیف ہیں اور بعض قوی۔ سب سے زیادہ قوی سند سے اور تفصیل کے ساتھ جو روایت آئی ہے وہ حضرت زید بن ارقم سے مسلم میں مروی ہے اس میں یہ بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غدیر خم کے مقام پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ "لوگو! میں ایک انسان ہوں، ہو سکتا ہے کہ اللہ کا فرستادہ (قضا کا پیغام لے کر) جلدی ہی آجائے اور میں اس پر لبیک کہوں (یعنی دنیا سے رخصت ہو جاؤں)۔ میں تمہارے درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑ رہا ہوں۔ پہلی اس میں سے کتاب اللہ ہے جس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ پس تم کتاب اللہ کو لو اور اسے مضبوط تھامو۔ اس سلسلے میں آپ نے حاضرین کو کتاب اللہ کی پیروی پر ابھارا اور اس کی طرف رغبت دلائی۔ پھر فرمایا اور دوسری چیز میرے اہل بیت ہیں۔ میں اپنے اہل بیت کے معاملے میں تم کو اللہ کی یاد دلاتا ہوں"۔ اس حدیث میں کوئی اشارہ اس طرف نہیں ہے کہ کتاب اللہ کے بعد بس میرے اہل بیت ہی ہیں جن سے تمہیں اپنا دین سیکھنا چاہیئے اور جن کی پیروی پر حصر کرنا چاہیئے۔ بلکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں چیزوں کو

ثقلین (بھاری چیزیں) دو الگ الگ معنوں میں فرمایا گیا ہے۔ کتاب اللہ اس لیے بھاری چیز ہے کہ وہی ہدایت کا سرچشمہ ہے اور اسے چھوڑنا یا اس سے منحرف ہونا تباہی و ضلالت کا موجب ہے۔ اور اہل بیت کو بھاری اس لیے فرمایا کہ ہمیشہ اکابر نوع انسانی کے اہل بیت ان کے پیروؤں کے لیے سخت وجہ آزمائش ثابت ہوئے ہیں۔ کسی نے ان کے حق میں افراط کی ہے اور غلو کر کے پیرزادوں کو معبود بنا ڈالا ہے۔ اور کسی نے ان کے حق میں تفریط کی ہے اور ان پر ظلم و ستم ڈھائے ہیں تاکہ امت کو جو فطری عقیدت اپنے رہبر اور ہادی کے خاندان والوں سے ہوتی ہے اس کو زبردستی دبایا جائے۔ اسی غرض کے لیے حضور نے فرمایا کہ میں اپنے اہل بیت کے معاملہ میں تم کو خدا کی یاد دلاتا ہوں۔ یعنی ان کے معاملے میں خدا سے ڈرو اور افراط و تفریط کے پہلو اختیار کرنے سے بچو۔

دوسرے اگر بالفرض مان لیا جائے کہ حضور نے اپنی عترت یا اہل بیت (دونوں ہی الفاظ حدیث میں آئے ہیں) سے دین سیکھنے کا ہی حکم دیا ہے تو ان الفاظ کا مفہوم آخر صرف اولاد علیؓ تک ہی کیوں محدود کر دیا گیا؟ اس میں از روئے قرآن ازواج نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی داخل ہیں اور ان میں آل جعفر، آل عقیل، آل عباس اور تمام بنو ہاشم بھی داخل ہیں جن پر حضور نے صدقہ حرام کیا۔

تیسرے یہ کہ حضور نے صرف یہی نہیں فرمایا ہے کہ ترکت فیکم الثقلین... بلکہ یہ بھی فرمایا کہ علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین (میری سنت اور ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت پر چلو) اور یہ بھی فرمایا ہے کہ اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم (میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں ان میں سے جس کسی کی پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے)۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ حضور کے ایک ارشاد کو تو لیا جائے اور دوسرے ارشادات کو چھوڑ دیا جائے؟ کیوں نہ اہل بیت سے بھی علم حاصل کیا جائے اور ان کے ساتھ خلفاء راشدین اور اصحاب نبی رضی اللہ عنہم سے بھی؟

چوتھے یہ کہ عقل بھی کسی طرح یہ باور نہیں کر سکتی کہ تیئیس سال کے دوران میں جو عظیم الشان کام نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سینکڑوں ہزاروں آدمیوں کی شرکت و رفاقت میں سرانجام دیا اور جسے

لاکھوں آدمیوں نے اپنی آنکھوں سے ہوتے دیکھا اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں صرف آپ کے گھر والوں پر ہی حصر کر لیا جائے اور ان بہت سے دوسرے لوگوں کو نظر انداز کر دیا جائے جو اس کام میں شریک ہوئے اور جنہوں نے اسے دیکھا۔ حالانکہ حضور کے گھر والوں میں سے خواتین کو اگر موقع ملا ہے تو زیادہ تر آپ کی خانگی زندگی دیکھنے کا موقع ملا ہے، اور مردوں میں ایک حضرت علی کے سوا کوئی دوسرا ایسا نہیں ہے جسے آپ کی رفاقت کا اتنا موقع ملا ہو جتنا حضرت ابوبکر، عمر، عثمان، ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور دوسرے بہت سے صحابہ کو ملا۔ پھر آخر محض اہل بیت ہی پر حصر کر لینے کی کونسی معقول وجہ ہے؟

اس سوال کو رد کرنے کے لیے بالآخر ایک گروہ کو یہ کہنا پڑا کہ گنتی کے چند آدمیوں کے سوا باقی تمام صحابہ معاذ اللہ منافق تھے۔ مگر یہ بات صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جو تعصب میں اندھا ہو چکا ہو۔ جسے نہ اس بات کی پروا ہو کہ تاریخ اس کی تمام خاک اندازیوں کے باوجود کس طرح اس کے قول کو جھٹلا رہی ہے اور نہ اس امر کی پروا ہو کہ اس قول سے خود سرکار رسالتماب اور آپ کے مشن پر کیسا سخت حرف آتا ہے کون معقول آدمی یہ تصور کر سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ سال تک اپنے جن رفقاء پر پورا اعتماد کیا اور جنہیں ساتھ لے کر عرب کی اصلاح کا اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا وہ سب منافق تھے؟ پھر کیا حضور ان کے نفاق سے آخر وقت تک بے خبر رہے؟ اگر یہ سچ ہے تو حضور کی مردم شناسی و فراست مشتبہ ہوئی جاتی ہے۔ اور اگر یہ غلط ہے، اور یقیناً غلط ہے تو آخر کیوں دین کا علم حاصل کرنے میں ان سب کی معلومات معتبر نہ ہوں؟

آپ کی الجھن کا دوسرا بڑا سبب یہ ہے کہ آپ کو کسی نے یہ بالکل غلط باور کرا دیا ہے کہ ائمہ اہل سنت نے مسائل دین کی تحقیق میں نہ اہل بیت سے رجوع کیا، نہ ان سے کوئی مسئلہ پوچھا اور نہ ان سے حدیث کی کوئی روایت لی۔ یہ غلطی حضرات اہل تشیع نے تو ضرور کی ہے کہ معلومات کے ایک ہی ذریعے (یعنی اہل بیت ــ جنہیں انہوں نے اہل بیت مانا) پر حصر کر لیا اور دوسرے تمام ذرائع کو چھوڑ دیا۔ مگر ائمہ اہل سنت نے یہ غلطی نہیں کی۔ انہوں نے وہ علم بھی لیا ہے جو اہل بیت کے پاس تھا اور وہ بھی لیا جو دوسرے صحابہ کرام کے پاس تھا، اور پھر پوری چھان بین کے بعد اپنے طرز تحقیق کے مطابق

فیصلہ کیا ہے کہ کس مسئلے میں کونسا طریقہ زیادہ صحیح اور معتبر ہے۔ مثال کے طور پر امام ابوحنیفہ ہی کو لیجئے۔ وہ جہاں دوسرے صحابہ و تابعین سے علم حاصل کرتے ہیں وہاں امام محمد باقرؒ امام جعفر صادقؒ حضرت زید بن علی بن حسینؓ اور محمد بن حنیفہ کے علم سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ یہی حال دوسرے فقہا اور محدثین کا بھی ہے۔ حدیث کی کونسی کتاب ہے جس میں بزرگان اہل بیت کی روایات نہ پائی جاتی ہوں؟ لیکن یہ کہنا کہ نماز یا کوئی دوسری چیز صرف وہی لی جاتی جو امام جعفر صادق کے پاس تھی کیونکہ انہوں نے امام محمد باقرؒ سے اور انہوں نے امام زین العابدینؒ سے اور انہوں نے امام حسینؓ سے اور انہوں نے حضرت علیؓ سے اور انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اُسے لیا تھا، صحیح نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر اسی ذریعے پر حصر کیوں کیا جائے؟ دوسرے ہزاروں لوگ بھی تو موجود تھے جنہوں نے نمازیں پڑھتے ہوئے اور دوسرے دینی کام کرتے ہوئے سینکڑوں تابعین کو اور انہوں نے سینکڑوں صحابہ کو دیکھا تھا اور ان سب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی آنکھوں سے یہی کام کرتے دیکھا تھا۔ آخر ان کو چھوڑنے اور صرف اہل بیت سے تمسک کرنے کی کیا وجہ ہے؟ صاحب البیت ادریٰ بما فیہ کوئی آیت قرآنی یا حدیث تو نہیں ہے کہ اس کی پیروی اختیار کر کے اُس نبی کی زندگی کے بارے میں صرف اس کے گھر والوں کے علم پر انحصار کر لیا جائے جس کی زندگی کا ننانوے فیصدی حصہ گھر سے باہر ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے سامنے گزرا ہے اور جس سے ہزارہا آدمیوں کو مختلف احوال و معاملات میں کسی نہ کسی طور پر سابقہ پیش آیا ہے۔

آپ کی الجھن کی تیسری وجہ یہ ہے کہ آپ مسائل دینی میں اختلافات کو دیکھ کر گھبرا اُٹھے ہیں اور یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ یہ اختلافات نہ ہوتے اگر صرف اہل بیت کے علم پر اکتفا کر لیا جاتا۔ حالانکہ یہ دونوں ہی باتیں غلط ہیں۔ نہ اختلافات کوئی گھبرانے کی چیز ہیں اور نہ اہل بیت کے متبعین ہی اختلاف سے بچ سکے ہیں۔ آپ اگر حضرات شیعہ کے مختلف فرقوں کے عقائد اور ان کے فقہی مذاہب کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہو کہ ان کے ہاں اس سے زیادہ اختلافات ہیں جتنے اہل سنت میں پائے جاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے مسلک کا ماخذ اہل بیت ہی کے علم کو قرار دیتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس دین کو کروڑوں انسان اختیار کریں اور جس کے ماخذ کا ہزاروں لاکھوں انسان مطالعہ کر کے غور و فکر کریں (باقی صفحہ ۱۵۳ پر)

(بقیہ رسائل و مسائل)

اس کے نصوص کی تعبیر اور احکام کی تفصیل اور جزئیات کی تحقیق میں کامل اتفاق کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے۔ اختلاف تو ایسی صورت میں فطرتاً پیدا ہوتا ہے اور اس کے رونما ہونے کو روکا نہیں جا سکتا۔ لیکن ان بیشمار اختلافات کے اندر ایک جوہری وحدت ہوتی ہے اور وہ اُن اساسی عقائد و اصول اور ان بڑے بڑے احکام کی بنیاد پر ہوتی ہے جن میں سب متفق پائے جاتے ہیں۔ اگر لوگ اصل اہمیت اس بنائے وحدت کو دیں اور جزوی اختلافات کو اپنی جگہ پر رکھیں تو کوئی قباحت واقع نہیں ہوتی۔ مگر جب لوگوں کیلئے اصل اہمیت اُن جزوی امور کی ہو جاتی ہے جن میں وہ آپس میں مختلف ہیں اور بنائے وحدت کو وہ خفیف سمجھنے لگتے ہیں تو پھر تفرقہ رونما ہوتا ہے۔ مثلاً نماز ہی کو لیجئے جس کے بارے میں آپ دریافت کر رہے ہیں۔ اس میں بنائے وحدت یہ ہے کہ سب مسلمان اللہ واحد ہی کی عبادت کرتے ہیں، اس کے طریق ادا کا ماخذ اسی نماز کو مانتے ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھائی، پانچ وقت کی نماز فرض مانتے ہیں، ایک ہی قبلے کی طرف رخ کرتے ہیں، وضو کو اس کیلئے شرط تسلیم کرتے ہیں، رکوع، سجدہ، قیام، قعدہ کو اس کی ہیئت کے اجزا مانتے ہیں، اور اس میں تلاوت قرآن اور اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اس بنائے وحدت کے بعد ان میں اختلافات کن چیزوں میں ہیں؟ ہاتھ کہاں باندھے جائیں، باندھے جائیں یا کھولے جائیں، آمین زور سے کہی جائے یا آہستہ، امام کے پیچھے فاتحہ پڑھیں یا نہ پڑھیں وغیرہ۔ ان جزوی امور میں جتنے بھی مختلف مذاہب ہیں ان میں سے ہر ایک اپنے پاس یہ دلیل رکھتا ہے کہ اس کا طریقہ کسی نہ کسی سند کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، اور وہ اپنی سند پیش کرتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ کس کی سند ضعیف ہے اور کس کی قوی، دیکھنا یہ ہے کہ ہر ایک کے پاس آخر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سند تو ہے۔ کسی نے یہ تو نہیں کہا کہ میں حضور کے سوا کسی اور کی سند پر یہ کام کرتا ہوں۔ پھر آخر کیا مضایقہ ہے، اگر ہم ایک طریقے پر (جس پر بھی ہمارا اطمینان ہو) عمل کرتے ہوئے دوسرے کے طریقے کو بھی مبنی برحق سمجھیں اور بنائے وحدت پر متفق رہیں؟